ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر بی بی امینہ ❁

ماضی پرستی یا خودفراریت؟
''سائے کی آواز'' کی نفسیاتی تعبیر

Nostalgia or Self-Escape Psychological Interpretation of *Saye ki Awaz*

By *Dr. Bibi Ameena, Lecturer, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad.*

ABSTRACT

The history of psychology is the history of man itself or we can say that psychology took birth with the birth of human being therefore, we witness its role in everything related to man. Its best example is literature that is directly related to human life that is why along with other factors psychology makes an integral part of its composition. But the study of psychology does not start after the creation of a master piece rather it takes place before it. Many topics are found scattered around a man of letters. However while creating a master piece he incorporates some factors and simply ignores the others. Thus a personal psychology of a writer becomes basis of the writing in which psychological factors can be sorted out by using the theories of psychologists. The novel *Saye ki Awaz* by the famous contemporary fiction writer Ikramullah is the same type of novel. It is a story of an old man who has developed an imaginary world that is filled with past memories on one hand and a conscious effort of self-escape on the other hand. Both of these are personality disorders. What is the reality out of these that is the question. This article deals with the psychological interpretation of *Saye ki Awaz* to get the answer of the question.

Key words: *Saye ki Awaz*, Ikramullah, Urdu Novel,

❁ لیکچرر، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

Nostalgia, Self Escape, Psychoanalysis

نفسیات کی تاریخ خود انسان کی تاریخ ہے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نفسیات کا جنم انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی ہوا اور اس کے بعد انسان سے وابستہ ہر شے میں اس کی کارفرمائیاں بھی دکھائی دینے لگیں۔ اس امر کی بہترین مثال ادب سے دی جا سکتی ہے، جس کا انسانی زندگی سے براہ راست تعلق ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی بنت میں جہاں دیگر عوامل اپنا حصہ ڈالتے ہیں وہیں اس میں نفسیاتی عناصر بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتے ہیں، جن کی بنیاد پر کسی ادب پارے کی نفسیاتی توجیہ پیش کی جاتی ہے۔ تاہم یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کسی بھی فن پارے کے نفسیاتی مطالعے کا آغاز کسی فن پارے کی تکمیل کے بعد سے نہیں بل کہ اس کی تخلیق سے پہلے ہوتا ہے۔ ادیب کے گرد و پیش میں کئی موضوعات بکھرے ہوتے ہیں، لیکن ادب کی تخلیق کے وقت وہ اولاً اس کے بنیادی ڈھانچے اور پھر اپنی نفسی کیفیات کے زیر اثر نیز اپنے تنقیدی ذوق کو بروے کار لاتے ہوئے بعض امور اپنے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے اور بعض سے قصداً چشم پوشی اختیار کرتا ہے۔ یوں اس کی انفرادی نفسیات اس کے کسی شہ کار کی تخلیق کا سبب بنتی ہے، جسے ماہرینِ نفسیات کے نظریات کی روشنی میں پرکھتے ہوئے اس میں موجود وہ نفسیاتی عوارض تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

اس مختصر تمہید کو مدنظر رکھا جائے تو عصر حاضر کے ایک قد آور فکشن نگار اکرام اللہ کا ناول ''سائے کی آواز'' بھی ایسا ہی ایک فن پارہ ہے، جو ۲۰۰۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور کی وساطت سے منظر عام پر آیا۔ یہ ۷۹ سالہ چیف اسٹیبلشمنٹ کمشنر آف دی پنجاب (ریٹائرڈ) کمال احمد کی کتھا ہے، جس کی شریک حیات دس برس قبل داغِ مفارقت دے چکی ہے اور دوست احباب بھی دنیا چھوڑ چکے ہیں۔ جب کہ کمال احمد نو برس قبل فالج کی بیماری میں مبتلا ہو کر اپنے اکلوتے بیٹے، بہو اور ان کے چار بچوں کے ساتھ ایک ہی گھر کے بیرونی کمرے میں رہائش پذیر ہونے کے باعث تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ اگرچہ ایک چھوکرا بہ ظاہر اس کی خدمت پر مامور ہے تاہم وہ بھی دیگر کاموں میں الجھے رہنے کے سبب اس کی دیکھ بھال سے قاصر ہے۔ چناں چہ اس کم نصیبی کے دور میں اس کی واحد خوشی اس کے دل کے نہاں خانے میں موجود اس کی بنائی ہوئی آرٹ گیلری ہے۔ اس گیلری میں اس کی نومحبوباؤں کی خوب صورت تصاویر آویزاں ہیں۔ یہ ان لڑکیوں کے پورٹریٹ ہیں، جو کسی نہ کسی فن لطیف میں مہارت رکھتی تھیں مثلاً گلی کشیدہ کاری، رقیہ شاعری، نسیمہ تقریر، کسم اداکاری، مارٹینا رقص، پشپا ستار نوازی، میرا چیٹر جی گانے، امرت مصوری اور فیروزہ طوائف ہونے کے سبب سے ناچنے اور گانے کی ماہر تھی۔ ان تمام لڑکیوں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سے اس کی جذباتی یا روحانی وابستگی دس سال سے تیس سال کی عمر تک رہی ہے۔ اب وہ انھیں کھو چکا ہے مگر وہ اس کی آرٹ گیلری اور یادوں میں زندہ ہیں اور اس کے لیے دیویوں کی حیثیت رکھتی ہیں، جو کسی بھی تکلیف یا دکھ کے لمحے میں آن موجود ہوتی ہیں اور اس کی سوچ کو اپنے حصار میں لیتے ہوئے اس سے ہم کلام ہوتی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود اس کے موجودہ حالات اسے اس بات پر اکساتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔ اور ایک دن اس کے گھر والوں کی بے حسی کے سبب ٹھٹھرتی سرد رات میں اس کی خواہش کی تکمیل ہونے لگتی ہے کہ موت بھی اس کے انتہائی قریب آ کر اسے دھوکا دے جاتی ہے۔

اس کہانی میں سب سے نمایاں چیز 'آرٹ گیلری' ہے، جو نہ صرف کہانی کے واقعات کا تسلسل برقرار رکھتی ہے بلکہ اس کی وجہ سے کبھی اس ناول میں ماضی پرستی (Nostalgia) کے عناصر دکھائی دیتے ہیں تو کبھی اس رنگین دنیا کی تخلیق کے پیچھے خود فراریت (Self-Escape) کی شعوری کوشش ملتی ہے۔ مزید برآں موضوع کے متعلق محمد ساجد کا ایک تنقیدی تبصرہ بھی ملتا ہے، جس میں ناول کی کہانی کا جائزہ لینے کے علاوہ اس میں موجود ناسٹلجیائی عناصر سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اکرام اللہ کے پورے ناول میں ناسٹلجیا کی فضا رچی بسی ہے۔[1] تاہم ماضی پرستی ہو یا خود فراریت، دونوں ہی نفسیاتی (Psychological) اور شخصیاتی عوارض (Personality Disorders) ہیں اور بہ ظاہر دونوں ہی ناول کے مرکزی کردار کی تخلیق میں معاون دکھائی دیتے ہیں۔ ان دونوں میں سے حقیقت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے زیر نظر مقالے میں مذکورہ ناول اور بالخصوص مرکزی کردار کی نفسیاتی تعبیر کی سعی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے اگر عنوان کو مدنظر رکھا جائے تو ''سائے کی آواز'' ہیلوسی نیشن (Hallucination) کی عکاسی کرتا ہے، جسے واہمہ یا ہذیان کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ادراکی تجربہ ہے، جو ماحول میں کسی شے کے موجود نہ ہونے کے باوجود اس کے موجود ہونے کے یقین سے عبارت ہے۔[2] اس ہذیانی کیفیت کی کارفرمائی نہ صرف مرکزی کردار کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے بل کہ اس کی ذات میں ماضی پرستی کو بھی داخل کر دیتی ہے، جسے نفسیات کی زبان میں 'ناسٹلجیا' کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ پہلی مرتبہ معروف یونانی شاعر ہومر (Homer) کی 'اوڈیسی' (۸۰۰ ق م) میں متعارف ہوا۔ ۱۶۸۸ء میں یونی ورسٹی آف باسل میں طب کے ایک طالب علم جوہانس ہوفر (Johannes Hofer:۱۶۶۹ء۔ ۱۷۵۲ء) نے اپنے مقالے میں استعمال کرتے ہوئے، اسے دو یونانی الفاظ NOTOS بمعنی 'گھر واپسی' اور AGLOS بمعنی 'کرب یا درد' کا مرکب بتایا۔ یوں ناسٹلجیا نہ صرف گھر واپسی یا ماضی کے کرب اور تکلیف کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا بل کہ ایک طبی اور عصابی بیماری تصور ہونے لگا اور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

بے چینی، اداسی، قنوطیت، بھوک میں کمی اور بے خوابی اس کی علامات سمجھی جانے لگیں۔ بیسویں صدی کے اختتام تک اسے نفسیاتی عارضہ ہی شمار کیا گیا۔ تاہم اکیسویں صدی کی نئی تحقیق کے مطابق اس کے مثبت پہلوؤں پر نظر کرتے ہوئے اسے زندگی میں معنویت کا منبع قرار دیا جاتا ہے، جو قوت حیوانی، ذہنی دباؤ اور اکتاہٹ کو کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔(۳)

یہ ناسٹلجیا ''سائے کی آواز'' میں بھی ایک ایسا احساس بن کر اُبھرتا ہے جو کمال احمد کی سماجی اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے نیز اسے اپنے ماضی سے ایسے واقعات اور حالات کی تلاش میں مدد دیتا ہے، جو اس کی موجودہ صورت حال کی ناگواری کو کسی حد تک کم کر سکیں۔ یوں وہ اپنے نامساعد حالات کی وجہ سے اپنی بکھرتی ہوئی شخصیت کے ٹکڑوں کو اپنے ماضی کے واقعات کی مدد سے مجتمع کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے کہ جب وہ اپنے جنم دن کو پرانی محبتوں کے واقعات، جگہوں اور لوگوں کے ساتھ منانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو اس کی خود کلامی کی معنی خیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے:

> آج ان کو اور اپنے آپ کو ایک نئے رخ سے دیکھنے کی کوشش کرو۔ جدھر پہلے دھیان نہیں گیا وہ اطراف تلاش کرو۔ بعض اوقات یونہی بیچ میں سے اچنبھا قسم کی باتیں نکل آیا کرتی ہیں، جو ان کرداروں پر نئی روشنی ڈالیں گی اور نئے نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ لمبا اور محنت طلب کام ہے، تاش کی قینچی والی بات نہیں۔ تمھیں اک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بہت سے بوجھل گھنٹوں کا وزن تمھاری جان سے کم ہو جائے گا۔(۴)

لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ کمال احمد ماضی کی جن ادھوری یا پوری کہانیوں کو نئے رخ سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس میں وہ کامیاب تو ضرور ہوتا ہے، لیکن کوئی بھی کہانی نہ تو اس کے لیے فخر کا باعث ہے اور نہ ہی شادمانی کا۔ نتیجے کے طور پر اس کی ماضی پسندی، خود فراریت کی طرف قدم بڑھانے لگتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ حقیقت سے فرار کا ذریعہ بن جاتی ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے:

> وہ سارا منظر مجھے کچھ اتنا گھسا پٹا اور کریہہ نظر آیا کہ میں نے اپنا مکروہ چہرہ تک ادھر سے پھیر لیا اور پھر اپنی برق رفتار یادوں میں کھو گیا۔(۵)

یوں کمال احمد کی یادِ ماضی اسے خود فراریت کا راستہ دکھا دیتی ہے تاہم یہ راستہ موت کی خواہش یا طلب کی طرف اس کی راہ نمائی کرتا ہے، جو ایک نفسیاتی پیچیدگی ہے۔ اس کی کارفرمائی زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر رائے

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

بُمیسٹر (Dr. Roy Baumeister: ۱۹۵۳ء) تصورات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں چھے عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ہدف تک نہ پہنچ پانے کی مایوسی

۲۔ اندرونی یا داخلی انتسابات اور منفی احساسات

۳۔ ضرر رساں حد تک خود آگاہی

۴۔ جذباتی تناؤ اور مخالفانہ موازنہ

۵۔ تخریب کا ادراک اور فرار کی سعی

۶۔ رکاوٹ یا مزاحمت کے نتائج

چوں کہ کوئی واقعہ یا تجربہ انسان کے طے کردہ معیارات (Standards) کے مطابق نہیں ہوتا اس لیے پہلے قدم پر فرد کو اس تلخ تجربے کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ حالات، جو انتہائی پست یا نا قابل بیان حد تک اذیت ناک ہیں یا تو غیر حقیقی امیدوں (Unrealistically Expectations) کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئے یا کسی مشکل یا کسی مسئلے کی وجہ سے یا پھر دونوں وجوہات کی بنا پر۔[۶] اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کمال احمد کا سب سے بڑا ا مسئلہ، فالج کا شکار ہونے کے بعد، اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کے ختم ہونے اور نظر انداز کیے جانے کی صورت میں تنہائی کا ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے، جس کا احساس اسے قدم قدم پر ہوتا ہے کہ جس محکمے میں اس نے ساری زندگی کام کیا اور جہاں کا نظام اس کے بغیر مفلوج ہو جاتا تھا، اب وہاں اسے کوئی نہیں جانتا؛ اس کی نظریں جو ہر دلیل کا منھ بند کر کے گھر والوں پر سکوت طاری کر دیا کرتی تھیں اب ان کی کوئی وقعت نہیں؛ بہو، جو اپنی من موہنی صورت کی وجہ سے اس کے دل میں گھر کر گئی تھی اب دل آزاری پر اتر آئی ہے اور جائداد اپنے شوہر کے نام کروا کر اس کے مرنے کی منتظر ہے؛ اس کی بیماری کی کسی کو کوئی پروا نہیں اور وہ اپنی کمائی میں سے بھی اپنی ذات پر خرچ کرنے کا مجاز نہیں کیوں کہ یہ رقم بعد میں بیٹے کو ملنی ہے اور گھر کے فیصلوں یا پوتی شمسہ کی شادی میں بھی اس کے مشوروں یا رائے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس صورت حال سے اس پر مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے خود کلامی کا سہارا لیتے ہوئے اس مسئلے کی نجات کے لیے کسی مناسب حل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے:

> مجھے اب گھر والوں پر رہ رہ کے غصہ آنے لگا ہے کہ کھونٹے سے بندھے جانور کی طرح بے زبان اور مجبور انسان کو سبھی نے یکسر اپنے دل و دماغ سے محو کر دیا ہے،

جیسے وہ ہے ہی نہیں... اپنے فالتو اور غیر اہم ہونے کے احساس نے دل کاٹ کے رکھ دیا۔ بے بسی نے تنہائی کی گونج کو میرے پیکر کے اندر اتنا شدید کر دیا گویا صورِ اسرافیل پھنک رہا ہو۔ دوسروں کے ضمیر پر بوجھ بن کے بیٹھ رہنا جسے وہ اپنا گناہ ہی تسلیم نہ کرتے ہوں، جینے کی شرم ناک کوشش ہے۔ میں نے ہندوستان کے پرانے جوگیوں اور سادھوؤں کی طرح سانس روک کر مر جانے کا فیصلہ کر لیا۔[۷]

ان مایوس کن حالات کا ذمے دار اپنی ذات کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ایسا رویہ ذات کے حوالے سے منفی پہلوؤں کو جنم دیتا ہے۔ اس طرح دوسرے مرحلے میں ایسے اندرونی یا داخلی عوامل ترتیب دیے جاتے ہیں یا ایسے داخلی انتسابات (Internal Attributions) کا ذکر کیا جاتا ہے، جن سے مایوس کن نتائج کی ذمے داری اپنی ذات پر ڈال کر ذات سے متعلق منفی احساسات پیدا کیے جا سکیں۔[۸] کمال احمد بھی اپنے غیر اہم ہونے کے ادراک کے بعد ایسی باتوں کے لیے اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرانا شروع کر دیتا ہے، جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ مثلاً چوں کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں اپنے کسی دوست سے کسی میدان میں نہیں جیت پایا لہٰذا اب اپنے تمام دوستوں کے مرنے کے بعد بھی اپنے زندہ رہنے کو ان سے جیتنے یا ان پر فوقیت حاصل کرنے سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا بھی ذکر کرنے لگتا ہے اور اپنی محبوباؤں میں سے فیروزہ کی موت کے حوالے سے بھی اپنی بزدلی کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے:

فیروزہ سے بہت تند و تیز قسم کا عشق کیا... ملاپ کا وقت آیا تو میں بھاگ اُٹھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بن آئی موت ماری گئی۔ میں اب چاہے نواسی برس کا ہو جاؤں یا ننانوے برس جیوں یا ایک سو ننانوے برس کا ہو کر دنیا کا معمر ترین آدمی کہلاؤں، مگر کمینہ ویسے کا ویسا رہوں گا، جیسا پچھلے اناسی برس سے چلا آ رہا ہوں۔ لمبی عمر پانے کے لیے شاید دوسروں سے بڑھ کر کمینہ ہونا بھی ایک لازمی شرط ہوتی ہے۔[۹]

چوں کہ اپنے آپ کو متعلقہ معیارات کے مطابق پرکھنے کے بعد ایک ذاتی آگہی یا خود شناسی (Self-Awareness) کی ضرر رساں حالت پیدا ہوتی ہے، جس کا تعلق ملامتِ ذات اور مایوسیوں سے ہوتا ہے، لہٰذا فرد اپنی ذات کے نا قابل، نا اہل، مجرم اور بد صورت ہونے سے آگاہ ہوتا ہے۔[۱۰] یہ تیسرا مرحلہ ہے جس سے کمال احمد کو بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اپنی ذات کے منفی پہلو جو اس پر آشکار ہوتے ہیں، خود شناسی یا ذاتی آگہی کے خلاف نفرت کو جنم دیتے ہیں اور وہ اپنی ذات کا مقرر کردہ معیارات سے موازنہ شروع کر دیتا ہے۔ نتیجتاً اپنے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

آپ کو غیر موزوں، نالائق اور مجرم محسوس کرنے لگتا ہے، جس میں مظلومیت کا احساس بھی در آتا ہے۔ وہ ہر موقعے پر اپنی بے بسی محسوس کرتا ہے کہ نہ تو وہ شمسہ کی چھوٹی سی عمر میں شادی کرنے کے فیصلے کے خلاف کچھ کر سکتا ہے اور نہ ہی چھوکرے کو اپنی بہو کی چھڑی کی مار سے بچا سکتا ہے، جو اسے اسی کی خواہش پر لیکن بہو کو بتائے بغیر پڑوس میں رہنے والی بڑھیا کی فاتحہ خوانی کے لیے لے گیا تھا۔ یہ تمام محرومیاں اس کے اندر اپنی ذات کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر دیتی ہیں:

> میری شخصیت کی بنت میں پہلے دن سے دو پتلی پتلی دھاریاں چل رہی ہیں۔ ایک خود غرضی کی اور دوسری بزدلی کی۔ عام آنکھ کو ان کا پتا نہیں چلتا۔ جو بہ نظر غائر دیکھنا جانتے ہیں، ان پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ مجھے اب آ کر دکھائی دینے لگی ہیں۔ ان میں سے مجھے کمینگی کی بو بھی آتی ہے۔ پتا نہیں دوسروں کو آتی ہے یا نہیں۔ [۱۱]

وہ مسلسل اپنی ذات اور مقرر کردہ معیارات کا مخالفانہ موازنہ شروع کر دیتا ہے یوں خود فراریت کے چوتھے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے، جس میں اپنی ذات سے معیارات کو پرکھنے پر منفی اثرات (Negative Affects) پیدا ہوتے ہیں۔ [۱۲] مثلاً جب شمسہ کے رشتے کے سلسلے میں آنے والے مہمانوں کے سامنے آنے سے اسے روکا جاتا ہے، تو اس زیادتی پر کمال احمد نہ صرف ان منفی اثرات کا برملا اظہار اور ان پر احتجاج کرنے لگتا ہے بلکہ خود ترسی کا شکار بھی ہو جاتا ہے:

> ''تم لوگ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ اپنے مہمانوں کی نظروں سے یہ ٹوٹا پھوٹا بدشکل بڈھا چھپا دینا چاہتے ہو۔ کل تک جس کا نام اپنی شان بڑھانے کے لیے استعمال کرتے رہے ہو۔ آج وہ تمھارے لیے شرمندگی کا سبب ہے؟ میں کہیں نہیں جاؤں گا اور اسی لان میں یہیں ٹھہروں گا۔ جاؤ مجھ سے منکر ہو جاؤ۔ ان سے کہہ دینا ہمارا کچھ نہیں لگتا۔''
>
> ''آؤ ثمینہ چلیں۔ یہ نہیں مان سکتے۔''
>
> ان کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک غصے اور رنج میں بیٹھا ہانپتا رہا اور منھ سے جھاگ تھوکتا رہا۔ ان احمقوں نے کس بے دردی سے مجھے میری خود کلامی کی پر امن جنت سے گھسیٹ کر باہر کھینچ لیا۔ اس میں کچھ قصور میرا بھی ہے۔ مجھے بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا، میں نے دیر کر دی۔ [۱۳]

اسی مخالفانہ موازنے سے اس پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ بہو مرنے کے سبب نہیں بلکہ خرچ کے خوف سے اس کی بیماری سے خوف زدہ ہے اور جب تک وہ بیمار نہیں ہوا تھا، بیٹے اور بیٹیوں کی اولاد سے اس کا باہمی پیار اور دوستی کا تعلق تھا اور وہ اپنا کچھ وقت کتابوں کے ساتھ بھی گزارتا تھا۔ لیکن فالج کی بیماری نے کتاب چھین لی؛ زبان بند کر دی اور چہرہ بگاڑ کے کچھ ڈراؤنا سا کر دیا جس کی وجہ سے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

چناں چہ ایسے حالات سے گھبرا کر وہ فرار کی کوشش کرتا ہے، یہ فرار فرد کا ایک بامعنی صورت حال سے ایک ذہنی تخریب کی سوچ سے عاری صورت حال میں جانے کی کوشش ہے۔ ایسا فرار اکثر کامیاب نہیں ہو پاتا اس لیے وہ فرد ان (منفی) خیالات کو روکنے کے لیے اور زیادہ طاقت ور ذرائع تلاش کرتا ہے،[۱۴] جو کمال احمد کو درپیش صورت حال میں کمرے میں واکر کے ذریعے چلنے، اپنے چھوٹے چھوٹے کام خود نمٹانے اور کتاب پڑھنے کی کوشش کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کوشش کے ذریعے وہ صورت حال سے فرار حاصل کر کے ایک ناخوش گوار صورت حال سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ منفی اثرات کو ختم کرنے کے لیے مختلف رویے اپناتا ہے، لیکن یہاں بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ چھٹے اور حتمی مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں برے خیالات کے ذہن سے اخراج یا خواہشات پر قابو پانے میں ناکامی سے پیدا ہونے والے ذہنی خلفشار کے نتائج خودکشی کی بڑھتی ہوئی خواہش کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں[۱۵] اور کمال احمد اپنی موجودہ زندگی کی بامعنی آگاہی، اس سے پیدا شدہ مسائل اور پھر اپنی ذات پر ان کے اثرات سے فرار حاصل کرنے کے ارادے یوں ظاہر کرنے لگتا ہے:

> لوٹنے کا تو اب بھی نہیں سوچتا، صرف آخری منزل کی طرف منتقلی جلد چاہنے لگا ہوں جیسے کبھی لڑکپن کے دنوں میں جوانی میں داخل ہونے کی جلدی تھی۔ وہ مہم جوئیوں کے شوق میں تھی۔ یہ عذاب سے نجات کی غرض سے ہے۔[۱۶]
>
> موت کے خیال سے لرز اٹھا کرتا تھا مگر آج نہیں... دراصل مرنے کے لیے راضی ہو گیا ہوں تو خوف جاتا رہا ہے جیسے خودکشی پہ کوئی کمر باندھ لے تو قاتل کو جانتے ہوئے اس سے ڈرتا نہیں جو وہ خود ہی ہوتا ہے۔[۱۷]

تاہم اس کے باوجود جب موت اُس پر مہربان ہونے لگتی ہے تو وہ اپنی قوتِ ارادی (Will Power) کے سبب اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ چوں کہ خود فراریت کی طرف جانے کا

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ہر مرحلہ متوقع نتائج پیش کرنے سے قاصر ہے، لہٰذا خودکشی کی نوبت نہیں آسکتی۔[۱۸] کمال احمد کسی بھی مصیبت یا مشکل کی ذمے داری اپنی ذات پر ضرور ڈالتا ہے تاہم وہ ان مشکلات کے حل کی خارجی صورت بھی نکال لیتا ہے یا انھیں بیرونی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں داخلی انتسابات اور ان کی کشمکش کو بیرونی ذرائع سے حل کرتے ہوئے کمال احمد کو جینے کی دو وجوہات نظر آتی ہیں، جنھیں اسی کے الفاظ میں نمبروار یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔''میرے پاس لے دے کے اب یہ گیلری ہے۔ میں نے ان نو سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سب کا سب نادانستہ سیکھا... ان کی بدولت مجھ میں پھیلاؤ آیا، گہرائی پیدا ہوئی۔ جو کچھ سمندر میں گرنے والے دریا اسے دیتے ہیں وہی کچھ انھوں نے مجھے دیا۔ مزاج میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ اپنے آپ پر ایک اعتبار ایک اعتماد آیا۔ اپنی ہی محبت میں بری طرح اُلجھی میری ذات کو اپنے آپ سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں چند سانس لینے کا موقع ملا۔ دل کو کشادگی اور طبیعت کو قلندری ملی... ہر چند میری یہ گیلری بھی ایک جھوٹ ہے، لیکن زندگی گزارنے کا ایک جواز تو بنا ہوا ہے۔ زندگی شاید بس یہی کچھ ہوتی ہے۔''[۱۹]

۲۔''ایسی خودکشی سے کیا حاصل کہ جن کے رویے کے خلاف بہ طور احتجاج یہ اقدام کیا جا رہا ہے، انھیں پتا ہی نہ چل سکے کہ خودکشی کی گئی اور وہ بھی ان کی ناقدری سے تنگ آ کر کی گئی... میں شاید یوں بدلتے حالات کے مطابق خود کو بدل لینے کی خوبی یا کمینگی کے باعث اتنی دیر جی گیا ہوں۔''[۲۰]

یوں کمال احمد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی گرہیں کھولنے کے بعد اگر آغاز کے سوال پر نظر ثانی کی جائے تو کہا جا سکتا ہے، ناول ''سائے کی آواز'' میں ناسٹلجیا کے عناصر کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں، لیکن اس بازخوانی میں خود فریبی اور خود فراریت اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ اب فراریت ماضی پسندی پر غالب دکھائی دیتی ہے۔ اس امر کا اظہار خود ناول نگار بھی کرتے ہیں جہاں وہ گیلری اور اس سے متعلقہ واقعات میں اپنے تخیل کی آمیزش کا اعتراف کرتے ہوئے اسے اپنے جینے کا جواز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تاہم اس ناول کی معنویت محض اس قدر ہی نہیں ہے بلکہ اسے نفسیاتی عناصر سے مزین زندگی کے ایک خوب صورت تصور اور رجائیت کا عکاس ناول بھی کہا جا سکتا ہے جس میں زندگی اور اس سے وابستہ خواہشات کا وہ رومانوی تصور منعکس ہوتا ہے، جو بے انتہا مشکلات، نامساعد حالات اور اندوہ ناک المیوں سے آمادہ بہ مبارزت رہتا ہے۔ اگرچہ ناول نگار بہ ظاہر چھوٹی چھوٹی جزئیات اور فلسفہ اور رمز سے آراستہ زبان کی مدد سے ایک ایسے معمر شخص کے جذبات میں ہمیں شریک کرتے ہیں، جو لمحہ بہ لمحہ موت کی جانب گامزن ہے لیکن اصل میں یہ ناول مایوسیوں کے اندھیرے میں زندگی کا ایک ایسا چراغِ روشن ہے، جو فرد کو رجائیت کا درس دیتا ہے؛ اس کے مثبت کردار کی سمت متعین کرتا ہے اور اسے زندگی کی اس نئی معنویت سے ہم کنار

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس میں بزدلی اور کم ہمتی کی قطعی گنجائش نہیں۔

حواشی

۱۔ محمد ساجد، ''سائے کی آواز ایک تنقیدی جائزہ از اکرام اللہ''، مشمولہ ''اخبار اردو''، اسلام آباد، شمارہ دسمبر تا جنوری ۲۰۱۴ء، ص ۴۱۔ ۴۲

۲۔ صوفی گلزار احمد (مرتب)، ''کشاف اصطلاحات نفسیات'' (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۷۷

۳۔ کونسٹنٹین سیڈیکیڈز اور ٹم وائلڈشٹ (Constantine Sedikides & Tim Wildschut)، Finding Meaning in Nostalgia، مشمولہ *Review of General Psychology*، ملاحظہ کیجیے: http://www.researchgate.net/publication/315973523_Finding_Meaning_in_Nostalgia، استفادہ: ۵ر فروری ۲۰۲۰ء، ص ۳۔ ۴

۴۔ اکرام اللہ، ''سائے کی آواز'' (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۵۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۶۔ رائے ایف بُمیسٹر (Roy F. Baumeister)، *Suicide as Escape from Self*، مشمولہ *Psychological Review*، جلد ۹۷، شمارہ ۱ (۱۹۹۰ء)، (واشنگٹن: امریکن سائیکولوجیکل ایسوسی ایشن)، ص ۹۱

۷۔ اکرام اللہ، ص ۱۸۷

۸۔ رائے ایف بُمیسٹر، ص ۹۱

۹۔ اکرام اللہ، ''سائے کی آواز''، ص ۹۔ ۱۰

۱۰۔ رائے ایف بُمیسٹر، ص ۹۱

۱۱۔ اکرام اللہ، ص ۱۸۱

۱۲۔ رائے ایف بُمیسٹر، ص ۹۱

۱۳۔ اکرام اللہ، ص ۸۶۔ ۸۷

۱۴۔ رائے ایف بُمیسٹر، ص ۹۱

۱۵۔ رائے ایف بُمیسٹر، ص ۹۱

۱۶۔ اکرام اللہ، ص ۳۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۸۔ رائے ایف بُمیسٹر، ص ۹۱

۱۹۔ اکرام اللہ، ص ۱۸۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۸۷

مآخذ

۱۔ اکرام اللہ، ''سائے کی آواز''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۲۔ ساجد، محمد، ''سائے کی آواز ایک تنقیدی جائزہ از اکرام اللہ''، مشمولہ ''اخبار اردو''، اسلام آباد، شمارہ دسمبر تا جنوری ۲۰۱۴ء

۳۔ گلزار احمد، صوفی (مرتب)، ''کشاف اصطلاحات نفسیات''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء

جریدہ

۱۔ ''اخبار اردو''، اسلام آباد، شمارہ دسمبر تا جنوری ۲۰۱۴ء
۲۔ ''سائیکولوجیکل ریویو''، جلد ۹۷، شمارہ ۱، واشنگٹن: امریکن سائیکولوجیکل ایسوسی ایشن

ویب سائٹ

1. http://www.researchgate.net/publication/315973523_Finding_Meaning_in_Nostalgia